شیخ رشید رضا کے مذہبی اور سیاسی افکار

(ڈاکٹر محمد راشد ندوی)

(۳)

۱۹۰۵ء کے بعد اصلاحی کاموں کی تمام ذمہ داریاں رشید رضا کے سر آ گئیں جہاں انہیں اب کئی محاذوں پر تنہا مقابلہ کرنا تھا۔ علماء سوء جو مسلمانوں کی ہر نئی تعلیمی اور سماجی اصلاح و ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ دوسرے مغربی نظریات و فلسفہ کے اثرات آہستہ آہستہ مختلف ذرائع سے عرب ممالک میں آ رہے تھے۔ شام کے علاقہ میں غیر ملکی مدارس، یونیورسٹیاں نیز مشنریز (مشنریز) اور مصر میں نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا وہ حصہ تھا جس کی کچھ تعلیم مصر میں ہوئی تھی اور اس وقت تک اعلیٰ تعلیم کا مرکز صرف ازہر تھا۔ اور اس طبقہ کو ازہر کی تعلیم و تربیت پر نہ تو اتفاق تھا اور نہ انہیں ان کے طریقہ تدریس میں تشفی ملتی تھی۔ اس طبقہ کو جب اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع یورپ کے مختلف ملکوں میں ملے تو انہوں نے مغربی نظریات جو مذہبی سماج اور تعلیم کے بارے میں تھے انہیں بغیر ہضم کیے ہوئے قبول کر لیا۔ اور انہیں کی نشر و اشاعت کو عرب عوام میں تجدید د

[illegible] کا واحد ذریعہ تصور کیا۔ اس سے جو طرح کے خطرات لاحق تھے عوام کا دین [illegible] عقائد کو بگڑی ہوئی شکل میں قبول کرتے جا رہے تھا۔ اس کا [illegible] ترقی [illegible] طبقہ [illegible] تعصب [illegible] حاصل کر رہا تھا [illegible] علمی [illegible] انکار [illegible] آجاتا [illegible] تعلیم [illegible] عقائد [illegible] طریقہ [illegible] استاد کے نقش قدم پر چلنے [illegible] اس وقت [illegible] روشنی کا منارہ [illegible] عوام کی [illegible]

سید رضا کا کہنا ہے کہ جہاں تک اسلام کے عقائد جو قرآن و سنت کی روشنی [illegible] متعین ہو چکے ہیں۔ اور ان پر علماء سلف کا تقریباً اتفاق بھی ہو چکا ہے [illegible] اس زمانے میں چھیڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان عقائد میں مسئلہ توحید، مسئلہ [illegible] قرآن کا آخری کتاب ہونا، حدیث کی اہمیت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت [illegible] کا قول و عمل یہ ہر زمانہ میں لوگوں کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ [illegible] جو انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی اور حالات کی تبدیلی سے پیدا ہوتے رہتے ہیں [illegible] رہیں گے۔ ان کے بارے میں مسلمانوں کی وہ جماعت جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور عقل سلیم عطا فرمائی ہے وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتے

رہیں ۔ اسی طرح شیخ رشید رضا نے بڑے وثوق و جرأت کے ساتھ بیسویں صدی
میں یہ بات کہی کہ اجتہاد کا دروازہ نہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ کبھی بند ہوگا۔ اجتہاد کا
دروازہ بند ہونے کا یہ مطلب ہے کہ امتِ مسلمہ کی ہر جماعت کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں
سلب ہو گئی ہیں ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی و فکری توانائی اس وقت تک باقی
و برقرار رہ سکتی ہے کہ جب تک کہ وہ دنیا اور دین کے تمام علوم سے بہرہ ور ہوں۔ ان کا
کہنا یہ ہے کہ کسی دور میں بھی اسلامی سوسائٹی کو دو گروہوں میں بانٹا نہیں جا سکتا یعنی
ایک گروہ علماء دین کا ہو اور دوسرا گروہ علماء دنیا کا۔ ایک کی ذہنی کاوشیں علوم دینیہ میں
صرف ہوں اور دوسرے کی علوم دنیاوی میں ۔ بلکہ علوم دین و علوم دنیاوی دونوں کا
سیکھنا اور جاننا ہر زمانہ میں سماج کے ہر فرد کے لیے ضروری ہے اور خاص طور سے اس
زمانہ میں جب کہ نئے علوم کی ضرورت ہر سماج کے لیے اتنی ہی ہے جتنی کہ ہوا اور
پانی اور روشنی کی ہوتی ہے ۔ اور اگر عوام میں دینی و دنیاوی علوم کی تفریق کا خطرناک
زہر پھیلایا گیا تو پورا سماج شل ہو جائے گا ۔ اور پوری سوسائٹی کی بنیادیں ڈھے پڑیں
گی ۔ اور ہر علاقہ کا مسلمان ذہنی غلامی کا اس طرح شکار ہو جائے گا کہ اسے کبھی بھی نجات
نہ مل سکے گی ۔ کیونکہ مذہبی فرائض کے انجام دینے کے بعد زندگی کی ہر ضروریات کے لیے
وہ دوسروں کا غلام رہے گا ۔ اس طرح رشید رضا نے تقریباً چالیس تک اصلاح و
تجدید کا بیڑہ اٹھائے رکھا ۔

اس مفکر کو جہاں عوام کو صحیح عقائد سے روشناس کرانا تھا وہیں (۳۱) کو ۱۹۰۵ء
سے لے کر (یعنی عبدہ کے انتقال کے بعد) ۱۹۳۵ء تک مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی
بھی کرنی پڑ رہی تھی ۔ کیونکہ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک پوری عرب دنیا بڑے
نازک مرحلوں سے گذری ۔ بلکہ اسی دور میں مصر کی غلامی کے بعد آہستہ آہستہ تمام عرب
ممالک یکے بعد دیگرے غیر ملکی سامراج کے جنگل میں آتے گئے ۔ ان حالات میں جو بھی

سیاسی تحریکیں اٹھیں یقیناً وہ اخلاص پر مبنی تھیں۔ مصر میں مصطفیٰ کامل کی قیادت میں حزب الوطنی جس کی رہنمائی مصطفیٰ کامل کر رہے تھے اور جو اپنی غیر معمولی شخصیت کی بنا پر مصری عوام کے محبوب لیڈر بن گئے۔ اس کے بعد ایک معتدل تحریک جس کی سیاست حالات سے مصالحت تھی۔ اس کی قیادت لطفی السید کر رہے تھے۔ پھر انگریزوں کی جارحانہ سیاست سے عوام کی بیداری بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بیداری بعد میں حزب الوفد کے نام سے رونما ہوئی جس کی قیادت سعد زغلول کر رہے تھے۔ ادھر شام، حجاز اور عراق میں دولت عثمانیہ کے خلاف عوام کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ عرب قوم پرور رہنما اس کو اور آگے بڑھا رہے تھے۔ فرانس اور برطانیہ ترکوں کے خلاف عرب ممالک میں تمام تحریکوں کی مدد کر رہے تھے اور کبھی کبھی ان کے رہنماؤں کو لالچ بھی دلا رہے تھے۔ بہرصورت یہ تحریکیں جس تیزی سے اٹھیں ان کا دبانا یا ترکوں اور ان کے درمیان مصالحت کرانا آسان نہیں تھا کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف آخری منزل تک پہونچ چکے تھے۔ رشید رضا بھی دولت عثمانیہ کی زیادتیوں اور ان کے حکام کی غیر حکیمانہ سیاست سے نالاں و پریشان تھے لیکن جب ان کے خلاف قومیت کی تحریک تیزی سے بڑھنے لگی تو ان کو آنے والے خطرات کا بھی احساس ہوا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ترکوں کے خلاف تو لکھا لیکن عرب قوم پروروں کو صحیح راہ بتانے سے عاجز ہو گئے تھے، ترکوں اور عربوں کے باہمی اختلاف کا پہلا اثر سرزمین حجاز میں نمایاں ہوا جب کہ شریف حسین نے وہاں بغاوت کی اور ترکوں فوجوں کو اس علاقہ سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد شام و عراق سے بھی آہستہ آہستہ عرب عوام ترکی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ جن لوگوں کی شہ پر انہوں نے یہ کامیابی حاصل کی ہے وہی لوگ دوسری طرف ان کی قبر تیار کر رہے ہیں۔ چنانچہ ترکوں سے انہیں آزادی ملی تو صرف چند سالوں

دو خوشیوں کی گذار سکے ۔ کیونکہ انھیں اوقات میں فرانس و برطانیہ بڑی خاموشی اور پوشیدگی سے عربوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے ۔ چنانچہ انگریز حسن کو عراق، فلسطین اور امارت عربیہ حصہ میں ملا اور شام کا پورا علاقہ فرانس کو مل گیا ۔ اس طرح انگریزوں کی وہ سیاست جو مصر سے لے کر ہندوستان تک تھی، اس میں وہ کامیاب ہو گئے ۔ دوسرے فرانس کی نظر ہمیشہ شام کے ساحلی علاقوں پر تھی، اس نے خوشی خوشی اس علاقہ کو اپنے اثر میں لے لیا ۔ اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے خاتمہ تک نجد و حجاز کے علاوہ تمام عرب ممالک غیر ملکی سامراج کے غلام بن گئے ۔

اس زمانہ میں مغربی طاقتوں نے دولت عثمانیہ پر جارحانہ کارروائیاں شروع کیں ۔ اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ۔ اتفاق سے مصطفیٰ کمال نے فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر ترکی بولنے والے علاقوں کو غیر ملکی سامراج سے بچا لیا ۔ لیکن خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر کے سیکولر (غیر دینی) حکومت کا اعلان کر دیا ۔ یہ اعلان دنیائے اسلام کے لیے بڑا خطرناک ثابت ہوا ۔ عربوں میں اس وقت دو رجحان تھے ۔ ایک رجحان مصطفیٰ کمال کی کارروائیوں سے پوری طرح متفق تھا بلکہ انہیں سراہ رہا تھا ۔ مصر میں جو ترقی پسند طبقہ تھا اس نے مصطفیٰ کمال کی اس کارروائی کو ترکوں کا اندرونی مسئلہ تصور کیا ۔ اور نئے اعلان کے تحت جو بھی سیاسی ڈھانچہ وہاں کے لیے مرتب ہوتا اس کا خیر مقدم کرتا ۔ اس وقت رشید رضا کو جو کل تک دولت عثمانیہ کے خلاف لکھ رہے تھے اب وہ خلافت کے پوری طرح حامی بن گئے اور مصطفیٰ کمال کے اعلان کو غیر عقلمندانہ تصور کیا ۔ بلکہ اس اعلان کو انہوں نے اسلام کے منافی بھی تصور کیا ۔ اس سلسلے میں انہوں نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو بعد میں الخلافۃ العظمیٰ کے عنوان سے منظر عام پر آیا جس میں انہوں نے اسلامی خلافت کی اہمیت کو واضح کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس حکومت کا ہونا ضروری ہے جس میں اسلامی

نظام و شعائر کی پاسبانی کی جارہی ہو اور وہ خلافت اسلامیہ کی رمز و علامت ہو۔
خلافت کا مسئلہ مصر میں رشید رضا اور ان کے چند ہمنوا اٹھائے ہوئے تھے۔ جس کی بازگشت ہندوستان میں بھی خلافت تحریک کے نام سے وجود میں آئی۔ جس سے یہاں ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے۔

رشید رضا مصر کے ان ترقی پسند رہنماؤں اور بانیوں سے بالکل متفق نہیں تھے جو غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ مصالحت کی دعوت دے رہے تھے اور اس طرح ان ترقی پسند مفکرین کے نظریات کے مخالف بھی تھے جو غیر ملکی تعلیم و تربیت اور نظام و قانون کو بعینہٖ قبول کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی علاقہ میں جہاں کے عوام کا ایک خاص مذہب ہو، ان کی طویل اور شاندار تاریخ ہو، ان کے آباؤ اجداد کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر روشن ہوں، ان سب کو نظر انداز کرکے کسی ایسے ملک یا قوم کے تعلیمی اور سیاسی نظام کو قبول کر لینا اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے بجائے ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ جب کوئی قوم اپنے کو اپنے شاندار ماضی سے الگ کرے اور غیروں کے طور طریقے اور زبان و ادب کو اپنائے تو وہ معنوی اعتبار سے بالکل ختم ہو جائے گی۔ اور جغرافیائی اعتبار سے اس کا وجود دنیا کے نقشہ پر تو یقیناً رہتا ہے لیکن سیاست کے میدان میں اس کا کوئی بھی وزن نہیں رہتا۔ چنانچہ اس خطرے کی نشاندہی اپنے مؤقر رسالہ المنار میں کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں وہ انگریزوں کے معتوب رہے اور وہ ان کے اور ان کے رسالہ کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

اس طرح جب فرانس نے شام پر قبضہ کر لیا جو ان کا وطن عزیز تھا تو اب وہ دولت عثمانیہ کے بجائے فرانسیسی سامراج کے خلاف آزادی کے مجاہدین کے ساتھ ساتھ لڑتے رہے۔ شکیب ارسلان کہتے ہیں کہ رشید رضا جن عقائد و اصول کے قائل تھے، ان کو وہ زندگی بھر نبھاتے رہے اور غیر ملکی سیاست کے خلاف زندگی بھر جہاد کرتے رہے۔

اور انہوں نے کبھی صلح نہیں کی۔ حالانکہ ان کو ہر طرح کی لالچ دلائی گئی لیکن اس مردِ مجاہد نے فقر کی زندگی کو ترجیح دی اور کبھی بھی دین و وطن کا سودا نہیں کیا۔

شیخ رشید رضا اس منزل میں اپنے استاذ شیخ عبدہ سے کچھ مختلف ہو جاتے ہیں۔ شیخ عبدہ نے جلا وطنی کے بعد مصر واپسی پر انگریزوں کے سلسلہ میں نرم رویہ اپنا لیا تھا۔ لیکن رشید رضا نے مربّیِ اول جمال الدین الافغانی کی سیاست کو دوسری لہر کے بعد زیادہ مناسب سمجھا۔ کیونکہ سامراجی طاقتوں نے دنیائے عرب اور دنیائے اسلام کے عوام پر جو مظالم ڈھائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ، ان کے مذہب، ان کی زبان کے خلاف جن سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا، اس کو کوئی بھی انسان جس کے دل میں اپنے مذہب کی محبت اور اپنی قوم سے لگاؤ ہے گوارہ نہیں کرسکتا۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ء تک کا یہ زمانہ عرب کی تاریخ کا سب سے نازک تر زمانہ تھا۔ اس عرصہ میں جو بھی رہنما اور مصلحین پیدا ہوئے ان کی ساری طاقتیں اور توانائیاں غیر ملکی سامراج کے خلاف لڑتے ہوئے ختم ہوئیں۔ اور اگر ان کے ملک میں آزادی ہوتی تو شاید اس عرصہ میں کوئی سنجیدہ اور تعمیری کام کر پاتے۔ مصطفیٰ کامل جیسا ذہین، سعد زغلول جیسا مدبّر، عبدہ جیسا مفکر، رشید رضا جیسا مخلص۔ ان سب کی طاقتیں اور توجہات اندرونی مسائل کو سلجھانے اور غیر ملکی سامراج کی معاندانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہوئیں۔ ان لوگوں کی زندگی سے یقیناً عزم و عزیمت کی ایک شاندار تاریخ تو ضرور مرتب ہوتی ہے لیکن بیسویں صدی کے عوام ان کے صحیح علمی اور فکری کارناموں سے یکسر محروم رہے کیونکہ وہ سکون و اطمینان کے ساتھ اگر کوئی کام کرتے تو ان کے ذہن و فکر کے جوہر سے علم و ادب کی تاریخ مالامال ہوتی۔ چنانچہ اس عرصہ کا پورا لٹریچر دفاعی ہی نظر آتا ہے۔ بہر صورت رشید رضا تقریباً نصف صدی تک عرب عوام کی مذہبی، سیاسی اور تعلیمی قیادت کرتے رہے اور جتنا ان کا ذہن رسا ہوا تھا ان کے قلم کو بھی ایک طاقت حاصل تھی۔ شکیب ارسلان

ایک جگہ لکھتے ہیں: کہ نئے دور کے مصنفین اور ادباء کے کارناموں کا موازنہ جب خود سے کرتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے علمی کارنامے سب سے زیادہ ہیں۔ البتہ شیخ رشید رضا پر مجھے ہمیشہ رشک ہوتا رہا کہ انہوں نے پچاس سال کے عرصہ میں جو کچھ لکھا اور کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے میرے علمی کارناموں پر بھاری ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ المنار کے علاوہ انہوں نے اس زمانہ کے جو بھی اہم موضوعات تھے ان پر لکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ماضی سے کتنے واقف، حال سے کتنا باخبر اور مستقبل کے بارے میں کس قدر سوچتے اور غور کرتے تھے۔ یہی ایک بڑے انسان کی بڑائی کی علامت ہے۔

(خدابخش لائبریری سیمینار میں پڑھا گیا)